سورۃ الجمعہ

کی حکیمانہ انقلابی تفسیر

تفسیر سورۃ الجمعہ

سورۃ الصّف کے ساتھ ربط :

رسول اللہ ﷺ کو اپنا بین الاقوامی پروگرام پورا کرنا اسی طریقے پر آسان تھا، جس پر حضرت مسیحؑ نے تورات کی اشاعت عامہ کی کوشش کی، یعنی ہر قوم میں سے اپنے نظریات ماننے والی جماعت تیار کرلی جائے اور وہی جماعت اپنی قوم کے مخالفوں سے لڑے اور اپنے پروگرام کو حاکمانہ شان دے دے۔ اگر ایک مرکز سے کوئی شہنشاہ اٹھے اور وہ ساری دنیا کو فتح کرتا پھرے، جیسے پہلے زمانے میں سکندر یا اس سے بھی پہلے ذوالقرنین کے نمونے موجود ہیں، تو وہ کوئی دیرپا بین الاقوامی مرکز پیدا نہیں کرسکتا اور نہ اس طرح سے پیدا شدہ بین الاقوامیت پائیدار ہوسکتی ہے۔ اگرچہ اس قسم کے حاکموں کا پیدا ہونا ایک فکر کے عمومی غلبے کے لئے ضروری ہے تاکہ عام لوگوں کو یہ سمجھ آجائے کہ اس فکر میں کتنی طاقت ہے کہ اس کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا، اس کے اظہار کے لئے وقتاً فوقتاً انسانیت میں بڑے بڑے اولوالعزم بادشاہ پیدا ہوتے رہتے ہیں، مگر ان کے ذریعے سے اوروں کی مستقل تربیت نہیں ہوسکتی۔

قومی انقلاب سے قرآنی تحریک کو فائدہ :

جیسے ایک شہر کی تہذیب و اصلاح کے لئے اس شہر کے ہر ایک خاندان کی اصلاح پر ہونی ضروری ہے، اسی طرح ایک مملکت کی اصلاح جو انقلاب کا نتیجہ ہونی چاہئے اس مملکت کے تمام شہروں میں اس تہذیب کے مراکز قائم کئے بغیر نہیں ہوسکتی۔ بین الاقوامی پروگرام کے لئے زبانوں سے علیحدہ ہونے والی قومیں ایک اکائی کا درجہ رکھتی ہیں۔ اکائیوں کی اصلاح مستقل بنیادوں پر قائم ہونی چاہئے۔ اب یہ چیز قائم ہوجائے تو بین الاقوامی پروگرام دنیا کے سامنے صاف ہوکر آئے گا، اور دیر تک چلے گا، اس میں یہ طاقت آجائے گی کہ اگر اس کی تحریک میں کبھی عارضی کمزوریاں پیدا ہوجائیں، تو اس کے اندر ہی سے انقلابی قوت پیدا ہوکر اس کمزوری کو دور کردے اور اس تحریک کی اصلاح کردے۔

مضبوط مرکز کا نقصان :

اگر قوموں کو کسی بین الاقوامی مرکز کے ساتھ اس طرح وابستہ کر دیا جائے کہ وہ بے دست و پا ہو کر رہ جائیں، تو اس مرکز میں کمزوری آنے کے بعد ان میں انقلابی تحریک پیدا ہونا اور ان کا اپنے پاؤں پر کھڑے ہونا نہایت مشکل ہو جائے گا۔ ایک بڑے مرکز سے اقوام میں ایک پروگرام جاری کرنے سے اگر یہ فائدہ سامنے آتا ہے کہ تحریک بہت جلد پھیل جاتی ہے تو اس کے مقابلہ میں یہ خطرہ بھی پیش نظر آتا ہے کہ اگر اس مرکز میں خرابی آجائے تو اتنی بڑی قوموں کی اصلاح خطرناک طور پر مشکل ہو جائے گی اور پھر وہ خرابی اندھے بچے دے کر قوموں کو بہت دور تک گمراہ کر دے گی۔

صحیح طریق عمل :

اس لئے صحیح طریق عمل جو آج تک دنیا میں تجربے سے مفید ثابت ہوا ہے، یہی ہے کہ ہر ایک قوم کے اندر اس کی ذہنیت کے مطابق اس کی زبان میں بین الاقوامی اھتداء کا مخزن جمع کر دیا جائے، وہ قوم اپنے بھلے برے کا فیصلہ کرنے کے لئے خود مختار ہو۔ اس طرح ایک پروگرام پر مختلف قومیں تیار ہو جائیں، تو ان کو کسی بھی مرکز میں بیٹھ کر، بین الاقوامی پروگرام کامیاب بنانا چنداں مشکل نہیں ہے۔

بین الاقوامی مرکز :

ہم اس بین الاقوامی مرکز کے لئے کوئی ایسی سرزمین تجویز نہیں کر سکتے، جو کسی خاص قوم کے تمدن سے رنگین ہو، اگر یہ بین الاقوامی مرکز کسی خاص متمدن قوم کے ہاتھوں میں آجائے گا، تو وہ اپنے قومی پروگرام ہی کو بین الاقوامی درجہ دینے کے لئے، اسے بری طرح استعمال کرے گی۔ اس لئے ہم حجاز کی سرزمین کو جو وادی غیر ذی زرع ہے اور جس کا بیت العلم اقوام میں "حرم" کا درجہ پیدا کر چکا ہے، بین الاقوامی مشاورت کے لئے بطور مرکز تجویز کرتے ہیں اور اس کی مرکزیت کو تمام دیگر مراکز پر راجح مانتے ہیں، بشرطیکہ اس پر کسی خاص متمدن قوم کا تغلب پیدا نہ ہو جائے اور حجاز اپنی فطری آزادی پر قائم رہے۔

سورۂ صف کے آخری حصے کے مطابق حضرت مسیحؑ کا جو طریق عمل بیان کیا گیا ہے، اس کے مطابق حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے جو تعلیمی مشن قائم کیا، اس کی مثال سورۃ الجمعہ میں یوں آتی ہے :

(۱) يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝ (۶۲ : ۱)

(جو مخلوقات آسمانوں اور زمین میں ہیں وہ سب اللہ کی تسبیح بیان کرتی ہے، جو بادشاہ، پاک ذات اور بڑا زبردست اور بڑی حکمت والا ہے۔)

کیا خدا محتاج ہے؟

اہل علم کو اشاعت معارف کی جو دعوت دی گئی ہے، اس میں اللہ ان کا محتاج نہیں ہے۔ زمین اور آسمان کا نظام اس پر گواہ ہے کہ اللہ اپنے کام اپنی حکمت کے مطابق چلاتا ہے۔ وہ اس میں کسی کا محتاج نہیں ہے، تو جو نظام وہ انسانوں میں پیدا کرنا چاہتا ہے اس کے لئے بھی وہ انسانوں کا محتاج نہیں ہو سکتا۔ پھر وہ انسانوں سے کیوں کہتا ہے کہ وہ، ''یہ کام کریں اور خدا کے لئے کریں؟'' یہ اس لئے کہ اس کے ذریعہ سے انسانوں کو ترقی کا موقعہ دیا جائے۔

زمین و آسمان اس اللہ کی پاکیزگی کی شہادت دیتے ہیں اور ان کی ساخت ثابت کرتی ہے کہ اللہ ان صفات کا حامل ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صفات اربعہ :

(۱) الملک (۲) القدوس (۳) العزیز (۴) الحکیم۔

اس کائنات میں خدا تعالیٰ کے ان اسماء حسنیٰ کا کامل ظہور ہو رہا ہے۔ چنانچہ خدا کے سوا کوئی شخص اپنے آپ کو حقیقی اور مطلق معنوں میں الملک (بادشاہ) نہیں کہہ سکتا۔ ساری کائنات میں حکومت اور بادشاہی دراصل اللہ ہی کی ہے۔ اسی طرح کوئی اپنے آپ کو عیوب ظاہری و باطنی سے قدوس (پاک) نہیں کہہ سکتا۔ کائنات صرف خدا ہی کو کامل اور اکمل طور پر عیوب سے پاک ثابت کرتی ہے۔ ایسے ہی حقیقی عزت اور اس کے ذریعہ سے غلبہ صرف خدا کو حاصل ہے اور سب کی عزتیں اور غلبے اس کے غلبے اور عزت کے دھندلے نقوش ہیں۔ حکیم بھی حقیقت میں اللہ ہی ہے، جو اس کائنات کا خالق باری اور مصور ہے، وہی اس کائنات کے تمام اجزا اور ان کے باہمی ربط اور ان کی اندرونی روح سے واقف ہے، پس حکمت کا مالک اصل میں اللہ ہی ہے۔

ان صفات کے بیان کی غرض :

اللہ تعالیٰ جو الملک، القدوس، العزیز اور الحکیم ہے، ان صفات کے تقاضوں پر انسان کو ترقی دینا چاہتا ہے۔

(۱) الملک

اللہ تعالیٰ انسانوں کو اپنی بادشاہی میں نیابت اور خلافت دینی چاہتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ جیسے اس کا حکم ملائک (فرشتوں) کے ذریعے سے آسمانوں میں پورا ہوتا ہے، اسی طرح نوع انسانی میں بھی اس کا حکم پاکباز فرشتہ خصلت انسانوں کے ذریعے سے پورا ہو۔

(۲) القدوس:

خدا تعالیٰ قدوس ہے، وہ تمام نقائص و عیوب سے پاک ہے، اس کے نام کی جو حکومت قائم ہو اور اس کے نام سے جو تعلیم دی جائے اس میں بھی انسانی عیوب پیدا نہیں ہونے چاہئیں، بلکہ وہ جماعت جو اللہ کے نام کی حکومت پیدا کرے انسانی کمالات کا بہترین مظاہرہ کرے اور اس میں خدا کی قدوسیت کا رنگ (صبغۃ اللہ) غالب ہو۔ دنیا کی حکمران جماعتوں میں جتنے عیوب پائے جاتے ہیں، یہ جماعت نسبتاً ان سے پاک ہو۔ دنیا کی معلم جماعتوں میں جس قدر غلطیاں راسخ ہو چکی ہیں، قدوسیوں کی یہ جماعت ان سے بھی پاک ہو۔ یہ اللہ کا منشا ہے اور قدوسیت الٰہی کے مناسب ہے۔

(۳) العزیز:

اللہ تعالیٰ ان قوموں کو جو قرآن حکیم کی تعلیم بلند کریں، عزت دینی چاہتا ہے، وہ اس تعلیم کے ذریعے سے دنیا میں غلبہ حاصل کریں گے۔ اور آخرت میں مراتب رفیعہ پر فائز ہوں گے۔

(۴) الحکیم:

عزت ایک دفعہ سیاسی یا فوجی غلبے سے حاصل ہو جاتی ہے، لیکن اسے صدیوں تک سنبھالنے کے لئے حکمت کی ضرورت ہوتی ہے، خدا اس جماعت کو حکمت بھی عطا کرنا چاہتا ہے تاکہ حکومت اور حکمت ان میں جمع ہو جائیں۔ کسی قوم میں حکومت سنبھالنے کی طاقت اتنی ہی ہو گی جتنی اس میں حکمت ہو گی۔

حکمت کیا ہے؟:

فطرت انسانی کے جو طبعی تقاضے ہیں، ان کی پوری سمجھ پیدا کرنا الحکمت ہے، یعنی افراد انسانی، اقوام اور اصناف کو سمجھنا اور انہیں نوعی تقاضوں کے ماتحت لانا حکمت ہے۔ افراد، اشخاص، اقوام اور اصناف کے تقاضے غیر متبدل نہیں ہیں مگر انسانیت کے تقاضے مستقل اور غیر متبدل ہیں۔ چنانچہ قرآن حکیم کہتا ہے۔ "لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ" (اللہ کی بناوٹ میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی) اور ان تقاضوں کو سمجھنا "ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ" (۳۰:۳۰) (یہی دین قیم ہے) اور ان تقاضوں کے مطابق قرآن کے احکام نافذ کرنا حکمت عملی ہے۔

اللہ چاہتا ہے کہ قرآن حکیم (یٰسٓ ۝۱ وَ الْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۝۲) کے ذریعے سے انسانوں کو حکمت سکھائے، پس خدا کی حاکمیت، قدوسیت، عزیزیت اور حکیمیت کا تقاضا ہے کہ ایک نبی ایسا پیدا ہو، جو ساری نوع انسانی کو نوعی تقاضوں کا صحیح علم دے، اور یہ علم منظّم طور پر اہل دنیا کو سمجھادے۔

اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ، الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔

قرآن حکیم نے اپنی آمد کا منشا ان الفاظ میں بتایا ہے :

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (۹:۶۱ اور ۴۸:۲۸)

(وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق دے کر بھیجا ہے تاکہ اس دینِ حق کو تمام ادیان پر غالب کردے۔)

اس کے لئے حزب اللہ کا قیام ضروری ہے جو قرآن حکیم کو اپنا پروگرام بناکر آگے بڑھائے اور غالب کرے۔ حزب اللہ کی تشکیل کا پروگرام سورۃ مجادلہ سے شروع ہوتا ہے اور اسی سورت سے حزب اللہ کے غلبہ کی پیشگوئی کی جارہی ہے۔ چنانچہ سورۃ مجادلہ کے آخری حصے میں آیا ہے کہ :

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِيْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝۲۱ (۵۸:۲۱)

یعنی (خدا تعالیٰ اور اس کے پیغمبروں کا دنیا میں غالب آنا حتمی اور یقینی ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ قوی ہے۔ اس لئے وہ اپنے رسولوں کی جماعتوں کو عزت دیا کرتا ہے۔)

وَ لِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَ لِرَسُوْلِهٖ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ (۶۳:۸)

(ہر قسم کی عزت اللہ کو اس کے پیغمبر اور مؤمنوں کے لیے ہے)

اس کے بعد سورہ حشر میں آتا ہے :

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۱ (۵۹ : ۱)

(جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، سب اللہ کے (مقرر شدہ قوانین پر چلتے ہوئے اسکی عظمت اور) پاکی بیان کرتے ہیں اور وہی زبردست طاقت اور غلبے والا (اور) حکمت والا ہے۔)

یہ سورت بھی حزب اللہ کے سیاسی غلبے کی پیشگوئی کرتی ہے جس کے لئے اس سورت (الحشر) میں حزب اللہ کے حربی پہلو کی تکمیل پر زور دیا گیا ہے۔ اس سورت کی ابتدائی آیت میں خدا تعالیٰ کی دو صفات العزیز اور الحکیم کا ذکر نہایت معنیٰ خیز ہے۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ حزب اللہ غلبہ حاصل کرے گا اور اس کے پروگرام کو زیادہ مستحکم اور پائیدار بنانے کے لئے اسے حکمت کی تعلیم دی جائے گی جس کے بغیر کوئی غلبہ مستقل نہیں ہوسکتا۔

اس کے بعد سورۃ الممتحنہ میں حزب کے نظام کو اندرونی طور پر مضبوط بنانے اور تعلقات خارجہ کو استوار کرنے کے لئے ہدایات دی گئی ہیں۔ اس لئے اس سورت میں "العزیز" اور "الحکیم" کے اسمائے حسنیٰ کے اعادہ کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

اس کے بعد سورہ صف میں سورۃ حشر کے مضمون کو آگے بڑھایا گیا ہے۔ یعنی سورہ حشر میں حزب اللہ کے حربی اصولوں کی تشکیل پر زور دیا گیا ہے تو سورۃ صف میں تیاری کے احکام دیئے گئے ہیں اور بنی اسرائیل کے قومی انقلاب کی مثال پیش کی گئی ہے، اس لئے یہاں پھر ان اسمائے حسنیٰ کا انتخاب کیا گیا ہے جن میں غلبہ کا پہلو ظاہر ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ۚ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝ (۵۹:۱)

(جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ سب اللہ کی تسبیح بیان کرتی ہے اور وہی غالب اور بڑی حکمت والا ہے۔)

سورۃ جمعہ میں غلبے کے اس پروگرام کو اور واضح کیا گیا ہے اور بنی اسماعیل کو بنی اسرائیل کی طرز پر نہ صرف قومی انقلاب کی دعوت دی گئی ہے، بلکہ دوسری قوموں میں قومی انقلابات لانے کی دعوت دی گئی ہے اور بنی اسرائیل میں جن باتوں نے انقلاب کی روح کچلی تو ان کی توضیح بھی کر دی گئی۔ اس لئے سورہ الحشر اور سورہ الصّف میں خدا تعالیٰ کے جو اسماء حسنیٰ آ چکے ہیں، یعنی اَلْعَزِیْزُ، اَلْحَكِیْمُ، عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ، اَلرَّحْمٰنُ، الرَّحِیْمُ، اَلْمَلِكُ، اَلْقُدُّوْس، اَلسَّلَامُ، اَلْمُؤْمِنُ، اَلْمُهَیْمِنُ، اَلْجَبَّارُ، اَلْمُتَكَبِّرُ، اَلْخَالِقُ، اَلْبَارِیءُ، اَلْمُصَوِّرُ۔ ان میں سے غلبہ ظاہر کرنے والے جامع اسماء حسنیٰ یعنی "اَلْمَلِكُ، اَلْقُدُّوْسُ، اَلْعَزِیْزُ اور اَلْحَكِیْمُ" کو سورۃ جمعہ کا عنوان بنایا گیا ہے۔

(۲) هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ۔

چنانچہ خدا نے اُمیوں میں سے ایک انسان چن لیا، اس کے اندر ایسی ہمت اور عالی دماغی پیدا کی کہ وہ اس نیابت الٰہی کے پورا کرنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

نبی اُمیّوں میں سے کیوں لیا گیا؟

وہ ان پڑھ لوگوں میں سے لئے گئے۔ کیونکہ پڑھے لکھے لوگ اہل کتاب، اپنی فطرت خراب کر چکے ہیں۔ ان کے قلوب شکوک و اوہام کے گہوارے بنے ہوئے ہیں۔ وہ حقیقت شناسی سے بیگانے ہو چکے ہیں۔ اس لئے ان کو کوئی بات سمجھانا آسان نہیں ہے۔ مکہ معظّمہ ایک غیر متمدن مرکز ہے اور کسی خاص قوم کے تمدن کے زیر اثر نہیں ہے۔

اس لئے بھی یہ مرکز اس قابل ہے کہ صحیح اور صالح تعلیم جو انسانیت کی اساس پر قائم ہو، اس قوم میں پھیل سکے۔ اہل قریش اسمٰعیلؑ کی اولاد سے ہیں، وہ قدیم روایات عالیہ کے حامل ہیں۔ اگرچہ اس وقت جہالت کے باعث ان کی حالت اچھی نہیں ہے، لیکن اوپر کے پردے کے نیچے، صالح اور کارکن طاقت موجود ہے۔ وہ بین الاقوامی پروگرام اخذ کرنے کی سب سے زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں، پھر ان پر کوئی حکومت بھی نہیں ہے، جس کی وجہ سے ان پر پابندیاں عائد ہوچکی ہوں۔ ہر ایک خاندان اور ہر گھرانہ اپنی فطری آزادی پر قائم ہے۔ اگر ان لوگوں کو بین الاقوامی پروگرام کے اصول صحیح طور پر سمجھادیئے جائیں، تو ان کے تمام خاندان اس میں رنگین ہوجائیں گے اور اس طرح بین الاقوامی کام کے لئے پنیری تیار ہوجائے گی۔

عام اہل یہود و نصاریٰ کو اہل کتاب اور اہل عرب کو اُمّی کہا گیا۔ ہمارے نزدیک مجوس، ہنود اور بدھ مت بھی اُمّی اقوام میں داخل ہیں۔ ان کے پاس کوئی کتاب نہیں ہے، جس کے احکام کو یہ ناقابل تبدیل قانون مانتے ہوں۔ اگر کوئی تھی بھی تو مرور زمانہ سے وہ عوام میں سے بالکل نکل چکی ہے اور عوام اتنے جاہل رہ گئے ہیں کہ انہیں کسی کا علم بھی نہیں ہے اور یہ صرف اپنے علماء کی زبانی تعلیم ہی کو خدائی تعلیم مانتے ہیں۔ صرف نصاریٰ اور یہود ساری انسانیت کو جامع نہیں ہیں۔ انسانیت کو جمع کرنے کے لئے ہنود، مجوس اور بُدھوں کو بھی ذہن میں لانا پڑتا ہے۔

''الملک'' کا اثر حیات انسانی پر :

چھوٹے چھوٹے فقرے ہوں، جن میں حکمت کے گر مستور ہوں، الفاظ فصیح ہوں، جملے کی ترکیب دلکش ہو، ایسے جملوں کو آیات کہا جاتا ہے۔

رسول ان کو اس قسم کی آیات سکھاتا ہے، جن میں فطرت انسانی کے مطابق احکام دیئے گئے ہیں۔ یہ احکام انسانیت عامہ کے تقاضے پورے کرتے ہیں، رسول ان کو یہ باتیں اپنی قوم کی مادری زبان میں جو فصاحت و بلاغت کی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے پڑھ پڑھ کر سناتا ہے اور یاد کرواتا ہے، کیونکہ یہ لوگ اَن پڑھ ہیں۔ اس قسم کے جملے ان کو روزمرہ کام آنے والے ہیں۔ یہ استدلال کی الجھنوں سے پاک ہیں۔ اس قسم کے مختصر جملوں پر حکمت کی بڑی عمارت کھڑی کی جاسکتی ہے۔

شاہ ولی اللہؒ نے حکمت کے چار اصول قرار دیئے ہیں :

(۱) طہارت (۲) سماحت (۳) خضوع (۴) عدالت

انہوں نے حکمت منزلی، حکمت بلدی، حکمت ملی اور بین الاقوامی حکمت انہی اصول اربعہ پر راجح کر دکھائی ہے۔

اگر ان اساسات کو چھوٹے چھوٹے جملوں میں بغیر کسی خاص ترتیب کے عام لوگوں کو پیش کر دیئے جائیں اور ان میں سے ہر شخص ایک جملہ چن کر اسے اپنا مقصد زندگی بنالے تو یہ اس قوم کی حکیمانہ ترقی کے لئے بنیاد ثابت ہوں گے۔

افسوس ہے کہ ہمارے ہاں حکمت کے ان جملوں کی اہمیت کو نظر انداز کر دیا گیا ہے اور فقط توحید کے لفظ کو سامنے رکھ کر تمام شرائع کو اس طرف راجع کر دکھایا ہے اور عدالت کو بالکل بھول گئے ہیں!

توحید اور عدل:

ہماری تحقیق یہ ہے کہ اسلام نے توحید پر جو زور دیا ہے اور شرک کے رد کی جو اہمیت جتائی ہے، تو اس کی روح یہ ہے کہ مشرک سب سے بڑا ظالم ہے۔ دوسرے لفظوں میں توحید، انسانیت کی سب سے محکم اساس ہے۔ اگر ہمارے بچوں اور ان پڑھ لوگوں کو اخلاق کے اساسی جملے یاد کرادیئے جائیں، جو ان کے روز مرہ میں استعمال ہو سکتے ہیں، تو ہماری جہتیں قرآن حکیم کے سمجھنے کے لئے بہت جلد تبدیل ہو سکتی ہیں، مگر اس کوتاہی نے باوجود بہت محنت کرنے کے ہمیں نتائج سے محروم کر رکھا ہے۔

اگرچہ تقویٰ کے لفظ میں عدالت شامل ہے جیسے "اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى" (۵:۸) سے سمجھ میں آتا ہے، یا جیسے شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ (۱۸:۳) کی آیت میں اشارہ ہے۔ اور ہم ان اشاروں کو صحیح طور پر سمجھ لیتے تو ہماری سوسائٹی اتنی نہ گرتی۔ "لا الٰہ الا اللہ" کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انصاف قائم کیا جائے۔ یہ "قَآئِمًا بِالْقِسْطِ" کا ترجمہ ہے۔ اگر کوئی جماعت اللہ کے سوا تمام معبودوں کا انکار کر دے اور جس سوسائٹی میں رہے، وہاں انصاف قائم کرے اور وہ انصاف کو اپنے ایمان کے مرکزی نقطے تک پہنچادے، یعنی اسے جتنا اللہ پر یقین ہے اسی قدر انصاف کرنا اپنا فرض بنالے تو اس سے بڑھ کر نہ انقلابی جماعت ہو سکتی ہے نہ اصلاح کرنے والی۔

خدا کی قدوسیت کا اثر:

(۲) وَيُزَكِّيهِمْ: جو بات کہی جائے سوچ سمجھ کر کہی جائے اور پوری ذمہ داری کے ساتھ کہی جائے۔

تزکیہ کیا ہے؟:

ایسی بات دنیا میں اثر پیدا کرتی ہے، اس سے انقلاب نمایاں ہوتا ہے اور اس سے اصلاح ہو سکتی ہے۔ پس سوچ سمجھ کر ذمہ داری سے بات کہنا تزکیہ ہے۔

لوگوں کو اصول بتادیئے گئے ہیں، اب ان سے جو کچھ کہا جائے وہ ان اصولوں کی طرف راجع ہونا چاہیئے۔ وہ اپنے معاملے کو گھر میں جاری کریں یا شہر میں۔ ان کا تعلق ان کی ذات کے ساتھ ہو یا حکومت کے ساتھ۔ ان اصولوں سے جو انہوں نے ابتدا میں اپنا لئے ہیں، باہر نہیں جائیں گے۔ ہر معاملے کی تہہ میں وہ انہی اصولوں کو ملحوظ رکھیں گے۔

ذمہ داری کا مطلب :

سوچ سمجھ کر کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب ایک بات کہتے ہیں، تو وہ خود بھی اس کے پورے پورے پابند ہوتے ہیں۔ یہ ان کی ذمہ دارانہ حیثیت ہے۔ اس کے لئے انسان تزکئے کے بعد ہی تیار ہوتا ہے۔ ان دونوں خوبیوں کے خلاف جو بات بھی ہو گی وہ گندی ہے۔ جس میں اس قسم کی کوئی گندی عادت ہو، اس کی نسبت کہا جائے گا وہ نادان یا جاہل ہے۔ ایک شخص کو کہا جائے کہ وہ بدمعاش ہے تو اس سے مراد یہ ہو گی کہ کہتا کچھ ہے اور کرتا کچھ ہے۔ اس قسم کی گندگیوں سے پاک انسان مزکی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی صحبت میں، انسان کو پاک کرنے کی طاقت ہے۔ ہر فرد کے دل میں پاکیزگی کا خیال مستقل طور پر قائم کر دیتے ہیں۔ یہ ہے "یُزَکِّیۡهِمۡ" کا ترجمہ۔

وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ

اَلْکِتَاب : "جماعتی قانون"، اسے افراد کی حالت سے کوئی تعلق نہیں، البتہ اگر جماعت مجموعی طور پر اس کی پابندی نہ کرے، تو برباد ہو جائے گی، افراد میں صلاحیت باقی رہے تو ممکن ہے مگر افراد میں مل کر کام کرنے کی صلاحیت ختم ہو جائے گی، اس قانون میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ وہ اس جماعت کا مستقل عنوان ہوتا ہے۔

نا قابل تبدیل قانون کو عربی میں، "لکھا ہوا قانون" کہا جاتا ہے۔ حاکم جب ایک قانون کو لکھ دیتا ہے، تو اس میں تبدیلی نہیں کرتا۔ اس لئے توریت کے غیر متبدل احکام عشرہ کو "الکتاب" کہا گیا ہے۔ اسی طرح قرآن حکیم کو بھی جو رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات میں غیر متبدل ہے اور جو حقیقت میں توریت ہی کا دوسرا ایڈیشن ہے "الکتاب" کہا گیا ہے۔

قرآن حکیم کی ایک ایک سورت بھی الکتاب ہے۔ اس میں مفرد جملوں کے تعلیمی درجے ہیں۔ بعض میں اونچی تعلیم ملحوظ رکھی گئی ہے۔ کتاب سمجھنے کا مطلب یہ ہے کہ اس ایک سورت کے ان مفرد جملوں یا آیتوں کے نظام کو سمجھا جائے۔

يُعَلِّمُهُمْ: "رسول اللہ ﷺ ان کو سکھاتے ہیں" یعنی ان میں یہ سمجھ پیدا کر دیتے ہیں۔ اب ایک، سورت پڑھنے والا

اس کا مطلب نکال لے گا، اس میں کوئی تمہید ہو گی، کوئی دلیل ہو گی اور کوئی نتیجہ ہو گا۔ سب میں ایک نظام اور ربط پایا جائے گا، اس کے بغیر کوئی مجموعہ، کتاب کہلا ہی نہیں سکتا۔

تناسق سورۃ اور ربط آیات کی ضرورت

نہایت افسوس ہے کہ گزشتہ پانچ سو برس میں سورتوں کے تناسق کا علم بہت تھوڑا رہ گیا ہے۔ گو آیات کے تناسق کا علم کافی حد تک محفوظ ہے۔ ایک ہی قسم کی آیتیں مختلف سورتوں میں رکھی گئی ہیں۔ لوگوں نے ان کے خصائص پر بحث کرنا بالکل چھوڑ دیا ہے۔ اگر یہ علم باقی رہتا تو دو مختلف خیال اپنے فکر کے لئے قرآن سے استدلال نہ کر سکتے۔ چونکہ سورتوں کے تناسق اور ایک ہی مضمون کی مختلف سورتوں کی آیتوں کے ربط کا علم نظر سے گم ہو چکا ہے۔ اس لئے ایک عالم ایک سورت کی ایک آیت سے ایک نتیجہ نکال لیتا ہے اور دوسرا عالم کسی دوسری سورت کی آیت سے ایک اور مطلب نکال لیتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قرآن حکیم سے دو مختلف چیزوں کے لئے سند مل سکتی ہے۔ قرآن حکیم کے متعلق اس قسم کا فکر پیدا کر دینا عقلمندوں کے نزدیک نہایت نازیبا ہے۔

قانون کی پابندی سے جماعت کی جو شیرازہ بندی ہوتی ہے، وہ اس جماعت کو عزت مند بناتی ہے، تو خدائے عزیز اس کتاب (قانون) کے ذریعے سے مومنوں کو عزت دینا چاہتا ہے۔

اَلْحَكِيْم کا اثر:

يُعَلِّمُهُمُ الْحِكْمَةَ

الحکمۃ قانون کی روح کا نام ہے۔

قرآن حکیم انسانیت میں جو تہذیب پیدا کرنی چاہتا ہے، اس کی بنیاد انسانیت کے عام اصولوں پر ہو گی۔ ان احکام سے یہ نتیجہ نکلے گا کہ انسانیت مکمل ہوتی جائے گی۔ احکام کی ایسی روح معین کر دینا، کہ ان احکام سے انسانیت کو اس طرح ترقی دینے کے سوا، دوسرے مطلب کے لئے کس طرح پڑھنی چاہئے؟ یہ الکتاب (The Letter of Law) ہے۔ اس کی تشریح و توضیح فقہاء (Gurists) کا کام ہے۔ قرآن حکیم نے نماز کے متعلق یہ بھی فرما دیا ہے کہ "اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ" (۲۰: ۱۴) (یعنی نماز ادا کرنا اس مطلب کے لئے ہے کہ انسان کو اس کا رب یاد آتا رہے)۔ یہ صلوٰۃ کی حکمت کہلائے گی۔ اب اگر ہم صورۃً جماعت کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں اور اس کے تمام قوانین کا پورا پورا لحاظ رکھتے ہیں، مگر اللہ کا ذکر ہماری طبیعتوں میں راسخ نہیں ہوتا، تو سمجھا جائے کہ ہماری نماز منافقانہ ہے اور نماز

پڑھنے سے کوئی دنیاوی فائدہ مقصود ہے۔اس ایک جملے نے نماز کو غلط طریقے پر استعمال کئے جانے سے روک دیا۔

اسی طرح قرآن حکیم کی نسبت کہا گیا کہ "هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ" یعنی یہ انصاف قائم کرنے والوں کے لیے رہنمائی کا کام دیتا ہے۔ اس ایک جملے میں قرآن حکیم کی ساری حکمت ضبط کر دی گئی ہے۔ اب اگر قرآن پڑھنے والوں کا مقصد انصاف قائم کرنا نہیں ہے، تو وہ حقیقت میں قرآن نہیں پڑھ رہے۔ وہ منافقانہ نماز کی طرح کوئی دنیاوی فائدہ حاصل کرنے کے لئے صورۃً قرآن کو ڈھال بناتے ہیں۔

(۲) "وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ"

یعنی "یہ لوگ اس سے پہلے ان قوانین اور ان کی روح سے قطعاً ناآشنا تھے۔" گو ان میں صلاحیت موجود تھی، مگر معلّمین سے بُعد ہو جانے کی وجہ سے ان کی سوسائٹی کا نظام، اس موضوع سے بہت دور آگے بڑھ کر یہاں تک پہنچا کہ اس جماعت نے قیصر و کسریٰ سے مقابلہ شروع کر دیا۔ یہ لوگ بین الاقوامی پروگرام سے ناآشنا تھے، لیکن جب وہ پروگرام ان کو دیا گیا تو انہوں نے اسے آگے بڑھانے کی تمام شرطیں پوری کیں اور دنیا کی سب سے بڑی شہنشاہیتوں کو چیلنج دے دیا۔ یہ نتیجہ تھا اس تربیت کا جو قرآن نے انہیں دی۔

(۳) وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔

(اور اس رسول کی بعثت) دوسرے لوگوں کے لیے بھی ہے جو ابھی ان میں شامل نہیں ہوئے۔ اور وہ اللہ بڑا زبردست بڑی حکمت والا ہے۔)

اُمّیوں کا دوسرا طبقہ :

"اٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ" سے مراد ایرانی ہیں۔ یہ امیوں کا دوسرا طبقہ ہے۔ بخاری میں روایت ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے حضرت سلمان فارسی سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ : دوسری قوم جو ابھی تک عرب سے نہیں ملی، وہ ان کی قوم ہے۔ "مِنْهُمْ" کی ضمیر "هُمْ" کا مرجع اُمیین ہی ہے۔

اہل فارس ابتداء میں ایک کتاب کے مالک تھے، لیکن اب وہ کتاب ایک چھوٹے سے طبقے میں محدود ہو کر رہ گئی تھی، جس نے اس کے علم پر قبضہ کر رکھا تھا اور یہ علماء ہی اس علم کے خزینہ دار رہ گئے تھے۔ عوام بالکل امی تھے۔ اب یہ لوگ عربوں سے قرآن حکیم کی تعلیم حاصل کر کے ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ آگے یہ چل کر ایرانی ہی ہندوؤں اور بدھوں کے استاد بنیں گے۔ چنانچہ ہندوستان میں اسلام ایرانی علماء کی کوششوں سے پھیلا، اسی طرح ترکوں کو بھی ایرانیوں ہی نے اسلام سے متعارف کرایا، اس طرح اسلام کی بین الاقوامیت متحقق ہو گئی۔

مکہ میں بین الاقوامیت اور اس کی بین الاقوامی ترقی کا بیج مکی زندگی میں ہی بویا گیا تھا، کیونکہ بلال حبشیؓ، صہیب رومیؓ اور سلمان فارسیؓ کو اس زمانے میں قریب کا ہم پلہ تسلیم کرلیا گیا تھا۔ جبکہ یہود نے تورات کو ماننے والی غیر یہودی اقوام کو اپنے برابر تسلیم کرنے سے انکار کردیا تھا۔ ابتدائی مکی زندگی میں جس بین الاقوامیت کی بنیاد اشخاص کی شمولیت سے رکھی گئی تھی، اس نے آگے چل کر اقوام کی بین الاقوامیت کی شکل اختیار کرلی۔ چنانچہ جہاد میں ایران فتح کرنے کے لئے عرب کے ساتھ عراقی نومسلم بھی شامل ہوئے۔ ایسے ہی رومی فتوحات میں، شام کے نومسلم عربوں کے شریک رہے۔ یہ وہ صورت ہے جس کی طرف سورہ صف کی آخری آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ طَّاۗىِٕفَةٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ وَكَفَرَتْ طَّاۗىِٕفَةٌ ۚ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰي عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ ۝

(مسلمانو! تم اللہ کے مددگار ہوجاؤ! جیسے عیسیٰ بن مریم نے (اپنے) حواریوں سے کہا تھا کہ اللہ کی راہ میں کون میرا مددگار ہوتا ہے؟ حواریوں نے کہا تھا، اللہ کے مددگار ہم ہیں۔ چنانچہ بنی اسرائیل کا ایک گروہ ایمان لایا اور ایک گروہ نے انکار کی راہ اختیار کی۔ پھر ہم نے ایمان لانے والوں کی، ان کے دشمنوں کے مقابلے میں تائید کی تو وہ غالب ہوگئے۔)

یعنی ہر قوم کو دعوت قرآن دی گئی، اس میں سے جو حصہ اس تحریک میں شامل ہوگیا، اس نے اپنی قوم کے ان لوگوں سے جنگ کی جو اس تحریک میں شامل نہ ہوئے اور خدا کی مدد سے وہ اپنے مخالفوں پر غالب آگئی۔ اس کام میں عربوں نے ان کی رہنمائی کی۔

غیر ممالک میں مراکز:

یہاں ایک مخفی دستورِ حقیقت کی طرف تنبیہ کرنے کی ضرورت ہے اور وہ یہ کہ عرب اپنے ایام جاہلیت میں ہجرت کرکے عراق اور شام میں جابسے تھے، انہوں نے اپنے عربی قومی خصائص ترک نہیں کئے تھے۔ وہ ان غالب قوموں کے اندر مقہور زندگی بسر کر رہے تھے۔ جب حجاز میں عربی انقلاب رونما ہوا تو یہ عربی قبائل خفیہ طور پر مسلمان ہوگئے۔ اور انہوں نے بعد میں مسلمان حملہ آوروں کی امداد کی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عراق اور شام بہت جلد مفتوح ہوگئے۔ ہماری سمجھ میں مکہ معظّمہ میں انہی قوموں کے مخفی ڈیپوٹیشن آتے رہے ہیں، جن کو 'جنوں' کے وفود سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس طرح عراق اور شام کی حدود کے اندر آنے والے انقلاب کے مراکز پیدا ہوچکے تھے۔ اسلامی فتوحات کی سرعت کا یہ راز ہے، جس کی طرف تاریخ ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ یہ سورہ صف ہی کی تعلیم کا نتیجہ

تھا کہ عراق اور شام کے اندر قرآن کی تعلیم پھیلائی گئی۔ جس سے خود ان قوموں کا ایک طائفہ اس پروگرام کو ماننے والا پیدا ہو گیا اور بعد میں اپنے دشمنوں سے اڑ گیا۔ حضرت نبی اکرم ﷺ کے تمام عملیات میں یہ حکمت ملحوظ نظر آتی ہے۔

(۴) ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ۔

(یہ (نبوت) اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا عطا فرماتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔)

بین الاقوامی مرکزیت :

یہ خصوصیت، جو اس بین الاقوامی مرکز قائم کرنے والی جماعت کو نصیب ہوئی کہ ان کے پروگرام پر دوسری قوموں کے حصے ٹھیک ہوتے جاتے ہیں، اور اپنی قوموں سے لڑنے میں زیادہ ہمت دکھاتے ہیں اللہ کا خاص فضل ہے۔

یہود کی گراوٹ :

حضرت مسیحؑ نے عدم تشدد کی پابندی کے ساتھ تعلیمی کام شروع کیا، ان کے حواریوں کی زندگی میں اس قسم کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں، کہ وہ تعلیم دیتے ہوئے شہید ہوئے مگر تعلیم کو ترک نہ کیا۔

حضرت مسیحؑ کے حواریوں کے کام کے نمونے پر رسول اللہ ﷺ کے ساتھیوں نے بھی کام کیا، یہ انصار اور مہاجرین ہیں۔ جب کام بڑھے گا تو فرائض تقسیم ہو جائیں گے، لیکن جو چیز سب میں مشترک رہے گی، وہ یہ ہے کہ وہ موت سے نہیں گھبرائیں گے، عدم تشدد کی پابندی کریں گے، تعلیم دیں گے اور جب تک انہیں خاص تیاری کے بعد حکم نہ دیا جائے، وہ لڑیں گے نہیں۔ اس کے باوجود وہ موت سے نہیں بھاگیں گے۔ ظاہر ہے کہ مخالف قوتیں کب یہ برداشت کر سکتی ہیں کہ ان کے نظام کو توڑنے والی تعلیم ان کے گھروں میں پھیلے؟ وہ ضرور رکاوٹیں ڈالیں گے، وہ ان لوگوں کو تکلیفیں پہنچائیں گے حتی کہ قتل بھی کریں گے۔ حضرت مسیحؑ کے حواریوں کی زندگی میں بھی اس قسم کی مثالیں ملتی ہیں۔ اب اگر ان میں یہ جذبہ کمزور ہو گیا ہے اور وہ موت سے گھبراتے نہیں تو وہ کارآمد ثابت نہیں ہوں گے۔ اگلی آیتوں میں یہی مضمون آتا ہے۔

(۵) مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ؕ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

(جن لوگوں پر توراۃ (کے علم و فضل) کا بار ڈالا گیا تھا، پھر انہوں نے اس کا بار نہ اٹھایا ان کی مثال اس گدھے کی سی

ہے جو بڑی بڑی کتابیں اٹھائے ہوئے ہو۔ جن لوگوں نے اللہ کی آیات کی تکذیب کی ان کی مثال (اس سے بھی) بری ہے اور ایسے ظالموں کو اللہ ہدایت نہیں دیا کرتا)

انقلاب کے لئے موت سے بے خوفی کی ضرورت :

یہود اس بزدلی اور منافقت کا مجسمہ ہیں، ان کا اس بات کو نہ سمجھنا کہ تعلیم موت سے نڈر ہوئے بغیر جاری نہیں رہ سکتی، ان کو انسانیت سے گرا دیتا ہے۔ وہ جس تحریک کے حامل ہیں، وہ اعلیٰ درجے کی انسانیت کی تحریک ہے۔ جس تحریک میں اتنی نہ سہی کسی درجے کی بھی انسانی عزت و شرف کا شائبہ ہو، گو وہ اتنی جامعیت نہ رکھتی ہو کہ، اس میں اخلاق فاضلہ اور اعمال صالحہ ہوں، بلکہ صرف ایک آدھ میں انسانیت کی شان بلند کرنے والی ہو، وہ بھی دنیا میں کامیاب نہیں ہو سکتی اور نہ اس کی تعلیم جاری رہ سکتی ہے، سواءِ اس کے جس کے نتیجہ میں پارٹی پیدا ہو اور جب تک اس کے معلم اور مبلغ موت سے نڈر ہو کر آگے نہ بڑھیں۔ یورپ کی انقلابی سوسائٹیوں کو دیکھ کر یہ فکر بالکل صاف ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ انسانیت کی بہت تھوڑی جزوی خدمت کے لئے کھڑے ہوتے ہیں، تو بھی ان کو موت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس کے باوجود وہ بے خوف ہو کر آگے بڑھتے ہیں اور کامیاب ہوتے ہیں۔

حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا : سمجھ میں نہیں آتا کہ علماء کی ایک جماعت ہے جو حضرت موسیٰؑ کی تعلیم کی حامل ہے۔ وہ یہ ضرورت محسوس نہیں کرتی۔ "لَمْ يَحْمِلُوْهَا" یعنی 'وہ اس ڈیوٹی کے لوازم محسوس نہیں کرتے'۔ "حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ" نام تو ہے تورات سکھانے والے، مگر سکھانے کی جو شرطیں ہیں، وہ اپنے اندر پیدا نہیں کرتے۔ اس صورت میں اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ وہ انسانیت سے گر گئے ہیں، کیونکہ انسانیت کا تقاضا تو یہ ہے کہ جس تعلیم کو قبول کیا ہے اسے آگے بڑھانے کے لئے موت تک قبول کی جائے۔ پس وہ نرے گدھے ہیں اور کتابیں لادے پھرتے ہیں، مگر ان کا مطلب نہیں سمجھتے جس سے ان کے دلوں میں کام کا ارادہ پیدا ہو۔ گدھے پر کتابیں لادو اسے کچھ خبر نہیں ہو گی کہ کتابیں ہیں یا اینٹیں !

بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

ظلم اور تکذیب اٰیات اللہ :

قرآن حکیم جیسی تعلیم کا ان کو گدھا کہنا معمولی بات نہیں ہے ! انہوں نے ظلم کی بنیاد ڈال دی ہے۔ انصاف کا ایک قانون قوم مانتی ہے، تو وہ دنیا میں بہترین نمونہ پیش کر سکتی ہے۔ اب انصاف کے اتنے بڑے قانون کو جو

حضرت موسیٰؑ کے ذریعے سے دنیا میں پھیلا، اُسے بیکار اور بے ثمر بنا دینا اور اس کی تعلیم برائے نام جاری رکھنا اور ایسے نمونے تیار کرنا جن سے کوئی شخص تربیت نہ پاسکے بہت بڑے ظلم کی بنیاد ڈالنا ہے۔ پھر یہ لوگ اپنے آپ کو مجرم تک نہیں مانتے، تو گویا موسیٰؑ کی تعلیم ان کے نزدیک صحیح نہیں تھی، اور صحیح طریقہ وہ ہے جس پر یہ لوگ چل رہے ہیں۔ یہ آیات اللہ کی صریحی تکذیب ہے۔ سیاسی کاموں میں اس طرح نہیں ہو سکتا کہ ایک تحریک کی تائید کرنے والا ہے اور دوسرا اسکی مخالفت میں بھاگ دوڑ کر رہا ہے۔ دونوں اس کے موید مان لئے جائیں، تو یہ حقیقت میں اس تحریک کی تکذیب ہے۔ 'کام سے انکار' کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ جہاں دینی کام میں سر دینا پڑے تو اس دین ہی سے انکار کر دینا۔

وَاللّٰہُ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ۔

ان لوگوں کو ایک دفعہ صحیح بات سمجھا دی گئی ہے، مگر اب وہ اس پر عمل کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے، اس لئے اب ان کو نیا نبی دینا ضروری نہیں۔ نبی ایسی مردہ جماعت کے سامنے آکر کیا کرے گا؟

وَلَقَدۡ ذَرَاۡنَا لِجَہَنَّمَ کَثِیۡرًا مِّنَ الۡجِنِّ وَالۡاِنۡسِ ۖ لَہُمۡ قُلُوۡبٌ لَّا یَفۡقَہُوۡنَ بِہَا ۫ وَلَہُمۡ اَعۡیُنٌ لَّا یُبۡصِرُوۡنَ بِہَا ۫ وَلَہُمۡ اٰذَانٌ لَّا یَسۡمَعُوۡنَ بِہَا ؕ اُولٰٓئِکَ کَالۡاَنۡعَامِ بَلۡ ہُمۡ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡغٰفِلُوۡنَ ﴿۱۷۹﴾ (۷:۱۷۹)

آیت کا خلاصہ یہ ہے "جو لوگ کتاب الٰہی کے حامل ہوتے ہوئے اور کائنات میں ہدایت کا سامان ہوتے ہوئے اور اس امر کے باوجود کہ ان کو قلب، بصر اور سمع جیسے ذرائع حصول علم دیئے گئے ہیں، وہ سوچ کر کام کا ارادہ نہیں کرتے، وہ حیوانوں سے بھی گئے گزرے ہیں، کیونکہ حیوانات علم حاصل کرنے کے ان ذرائع سے محروم ہیں، وہ اگر سوچ سمجھ کر اپنی راہ عمل تعین نہ کریں، تو یہ ان کی فطرت ہے۔ مگر انسان جب اس قسم کی روش اختیار کرے تو وہ اپنی انسانیت سے گر جاتا ہے۔ پھر یہ نہیں کہ وہ مطلق حیوانیت کے مقام پر ٹھہر جائے بلکہ وہ اپنے قویٰ کو غلط طریق پر استعمال کرتا ہے۔ اور اس طرح حیوانیت مطلقہ سے بھی گر جاتا ہے۔ اس لئے اس آیت میں کہا گیا کہ ؛ بِئۡسَ مِثۡلُ۔ ان کی مثال بہت بری ہے۔

اب یہود کو ان کی غلطی پر صاف الفاظ میں متنبہ کیا جاتا ہے۔

(۶) قُلۡ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ ہَادُوۡۤا اِنۡ زَعَمۡتُمۡ اَنَّکُمۡ اَوۡلِیَآءُ لِلّٰہِ مِنۡ دُوۡنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الۡمَوۡتَ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۶﴾

(اے پیغمبر!) یہودیوں سے کہہ دو کہ اگر تمہیں اس بات کا دعویٰ ہے کہ تمام بندوں میں سے صرف تم اللہ کے ولی اور دوست ہو تو اس کی آزمائش یہ ہے کہ (خدا کی راہ میں) موت کی آرزو کرو اگر تم سچے ہو (تو ضرور ایسا کرو گے)۔

یہود کو چیلنج :

یعنی "اگر یہود کا یہ خیال ہے کہ خدا تعالیٰ نے جس طرح موسیٰؑ کو ساری دنیا سے چن لیا، ایسے ہی موسیٰؑ کے متبع ہونے کی وجہ سے یہود دنیا کی ممتاز ترین قوم ہے اور کوئی قوم اس مقام پر نہیں پہنچتی، تو ان کا زعم صرف اسی صورت میں صحیح مانا جاسکتا ہے کہ موسیٰؑ کی تعلیم کے پورے پورے پابند ہوں اور خدا سے موت مانگیں، یعنی جس میدان میں موت کا اندیشہ ہو وہاں آگے بڑھ کر اپنی تعلیمات کو پھیلائیں"۔ یہ لوگ اپنے آپ کو حضرت مسیحؑ کے حواریوں سے بہتر مانتے ہیں مگر وہ لوگ (حواری) تو مسیح کی تعلیم اور تورات موت کے منہ میں جاکر پہنچا آتے ہیں، اگر یہود سچے ہیں تو انہیں بھی اس طرح آگے بڑھ کر میدان میں جانا چاہئے۔

تمنائے موت کی تفسیر قرآن سے :

تمنائے موت کی تفسیر قرآن نے کردی ہے۔ ایک صحابی بدر میں حاضر نہ ہوسکے تھے، وہ کہنے لگے کہ کاش! ہمیں بھی کفار سے لڑنے کا موقع ملتا! پھر اللہ سبحان تعالیٰ دیکھتا کہ ہم کیا کرتے ہیں۔ اس کے بعد احد کی جنگ ہوئی، وہ اصحابی اس جنگ میں شامل تھے۔ مگر احد میں شکست ہوئی اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ ۖ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۱۴۳﴾ (۳ : ۱۴۲)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی اصطلاح میں تمنائے موت کی معنی ہیں : میدان جنگ میں جانے کے لئے آمادہ ہونا، دوسرے لفظوں میں قتل ہونے کے لئے اپنے آپ کو پیش کرنا! قرآن کا پروگرام ہو یا تورات وہ ایک ہی چیز ہے۔ یورپ کی انقلابی جماعتوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس میں موت سے نڈر ہونے کا مادہ نہ ہو، وہ کسی معمولی انقلابی تحریک کو کامیابی سے نہیں چلا سکتا، قرآن حکیم یا تورات کے انقلاب کو کامیاب بنانا تو بہت بڑی چیز ہے۔

(۷) وَلَا يَتَمَنَّوْنَهٗٓ اَبَدًا ۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۷﴾

(اور یہ کبھی موت کی تمنا کرنے والے نہیں، کیونکہ انہوں نے ایسے کام کیے ہیں جو انہیں موت کے تصور سے ڈراتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو خوب سمجھتے ہیں۔)

موت سے بھاگنے کا سبب :

چونکہ یہ لوگ انسانیت کے درجہ سے گر چکے ہیں، اس لئے یہ کبھی ایسے میدان میں نہیں اتریں گے، جہاں

انہیں موت کا خوف ہوگا۔ غلط طریقے پر زندگی تعمیر کرنا، اپنے شرعی پروگرام کی مخالفت کرتے ہوئے سامان زندگی جمع کرنا سب سے بڑا ظلم ہے۔ جس کی ایک علمی جماعت مرتکب نہیں ہوسکتی ہے۔ اگر وہ ایسے موقعوں پر جانے لگیں تو جو سامان انہوں نے اکٹھا کر رکھا ہے اور جس کے بڑھانے میں وہ دن رات مگن ہیں، وہ برباد ہو جائے گا۔ مگر انہیں سامان دنیا کی فراغت نصیب نہ ہوگی، جب تک وہ اپنے قانون کی حکومت نہ کرلیں گے۔ لیکن وہ اس قانون کی حکومت قائم کرنے کے لئے قربانی دینے کو تیار نہیں اس لئے ان کا اس پروگرام پر قبضہ جما کر بیٹھنا ظلم عظیم ہے۔

ہم نے اپنی بیرونی زندگی میں اپنے ہندوستانی نوجوانوں کو جو کالجوں میں تعلیم پاچکے تھے، یا ہماری اپنی درسگاہوں میں پڑھ چکے تھے، کا کافی تجربہ کیا ہے۔ ان میں موت کے منہ میں جانے کی ہمت کسی دوسری قوم کے نوجوانوں سے کم نہیں پائی گئی۔ ایک ایک آدمی کو تین تین دفعہ موت کے منہ میں بھیجا گیا۔ وہ خوشی خوشی گیا اور کامیاب واپس آیا۔ اگر ہم یہ چیزیں نہ دیکھ لیتے تو ہمیں کبھی یہ ہمت نہ ہوتی کہ ہم شاہ ولی اللہؒ کے پروگرام یا شیخ الہندؒ کے پروگرام کو زندہ کرنے کا نام لیتے، چونکہ ہمارے نوجوانوں میں یہ مرض سرایت نہیں کئے ہوئے، اس لئے ہم خداوند تعالیٰ سے توقع رکھتے ہیں کہ اگر ہماری قوم میں دین کی پابندی کے ساتھ آج کے سائنٹفک انقلاب کا ڈھنگ پیدا ہوسکے تو ہم دنیا کی قوموں کی صف اول میں بیٹھ سکیں گے، اسے چاہے مرض سمجھو یا خوبی ہماری قوم دین کے پروگرام کے سوا کسی اور پروگرام پر اٹھے گی نہیں۔ یورپین ذہنیت کے لوگ اسے مرض ہی سے تعبیر کرتے ہیں، مگر ہمارے پاس ایک دینی انقلابی پروگرام موجود ہے اور وہ ایک ایسی جماعت کے ہاتھ پر ہے جس کے تربیت یافتہ نوجوان موت سے نہیں گھبراتے، اس لئے ہم یقین رکھتے ہیں کہ اگر ان کو اس پروگرام سے پوری طرح واقف کر دیا جائے تو وہ کسی دوسری قوم سے ہرگز پیچھے نہ رہیں گے۔

جو موت سے نہیں گھبراتے وہ پیچھے ہٹ نہیں سکتے :

یہاں ہم یہ بات نہایت بلند آہنگی کے ساتھ کہنا چاہتے ہیں، کہ اگر کوئی مرشد نما بزرگ، علمی نقصان رکھنے والا استاد، موت کے منہ میں جانے کے لئے آمادہ نہیں ہے تو اسے جماعت کی سرداری سے مستعفی ہو جانا چاہئے۔ ہمارے استاد حضرت مولانا محمود حسنؒ ہمارے بزرگوں میں تیسرے طبقے کے آدمی ہیں، پہلے طبقے کے لوگ وہ تھے جو حضرت مولانا کے ساتھی تھے، دوسرے طبقے کے وہ لوگ تھے جو مولانا گنگوہیؒ کی طرز کے تھے۔ مولانا شیخ الہند دونوں جماعتوں سے پیچھے کی جماعت کے تھے۔ ہم نے ان کو موت سے اتنا بے خوف دیکھا ہے کہ ہم دنیا کے کسی انقلابی کو ان کے برابر نہیں مان سکتے۔ اس لئے ہماری طبیعت میں فخر ہے کہ ہمارا استاد دنیا کا سب سے زیادہ موت

سے بے خوف بزرگ تھا۔ جس جماعت کا رہنما ایسا ہو اور جس کے نوجوان افراد ایسے ہوں جیسے ہم نے دیکھے، وہ دنیا میں ناکام نہیں رہ سکتے۔ معلوم ہو کہ کامیابی کی شرط یہ ہے کہ موت سے ڈرنے والے آدمیوں کو جماعت کی رکنیت سے قطعاً خارج کر دیا جائے۔

ہمارے استاد جہاد کی تحریک کے رہنما، ہماری اس جماعت کے سب آدمی اس چیز کو جانتے ہیں، حتیٰ کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی ترجمان القرآن میں سورۂ برات کی کسی آیت کی تفسیر میں اشارہ کیا ہے کہ انہوں نے فلاں سن میں علماء کو دعوت جہاد دینی شروع کی، تو سوائے مولانا (شیخ الہند) کے اس تحریک کا کہیں سے جواب نہ ملا۔ یہ اتنی صاف بات ہے کہ مولانا ابوالکلام بھی جو دوسری جماعت سے تعلق رکھتے تھے، اسے جانتے ہیں۔ اسی طرح علی گڑھ کی جماعت کے لوگ بھی اسے جانتے ہیں۔ اب اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں، مولانا شیخ الہند کی جماعت میں ایک طبقہ ان کی تحریک کی عملاً مخالفت کرتا رہا۔ کم سے کم ان کے عمل سے بھی یہی سمجھ میں آتا ہے کہ مولانا شیخ الہند کے طریقے کی تغلیط ہو جاتی ہے، مگر وہ مولانا کے خلاف زبان سے کچھ نہیں کہتے۔ ہم نے ایک مرتبہ اپنی جماعت کے لوگوں کو ایک مثال دے کر یہ بات سمجھائی کہ مولانا شیخ الہندؒ کو ماننے والی جماعت تین حصوں میں تقسیم ہو گئی۔

(۱) ایک جماعت تو وہ ہے، جو حضرت مولانا شیخ الہند کے پروگرام کو صحیح مانتی ہے اور ان کے ساتھ شریک کار ہو گئی ہے۔

(۲) دوسری جماعت وہ ہے کہ ان کے پروگرام کو صحیح تو مانتی ہے لیکن یہ لوگ کام نہ کر سکے اور کمزوری کا عذر پیش کرنے لگے اور اپنے آپ کو مجرم کے طور پر پیش کرنے لگے۔ یہ دونوں لوگ ایسے ہیں جیسے رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ایمان والی جماعت تھی۔

(۳) تیسری قسم کے لوگ وہ ہیں، جو اپنے قول و فعل سے حضرت مولانا شیخ الہند کے پروگرام کو غلط ثابت کرتے ہیں۔ اور مدعی ہیں کہ ہم مولانا شیخ الہندؒ کے شاگرد ہیں۔ اور ان کے علوم کے حامل ہیں۔ یہ جماعت ایسی ہے جیسی رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں منافقین کی جماعت تھی۔

اب ہم کہتے ہیں کہ یا تو ماننا پڑے گا کہ نعوذ باللہ مولانا شیخ الہندؒ جاہل اور مفسد تھے، انہوں نے مسلمانوں کو غلط راستے پر ڈال دیا اور ان کو بہت نقصان پہنچایا۔ اگر مولانا شیخ الہندؒ کو حق پر مان لیا جائے تو ان کے اتباع میں سے جو لوگ ان کی مخالفت کرتے ہیں اور فکراً ان کے خلاف تلقین کرتے ہیں، وہ ان کے مکذب ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ مولانا شیخ الہندؒ کا مسلک بھی ٹھیک ہو، اور ان کے خلاف دعوت دینے والی جماعت، راستی پر ہو۔ اس قسم کے لوگوں کو ضرور دیوبندی جماعت کی لیڈر شپ سے علیحدہ کر دیا جانا چاہئے۔ جب تک یہ منافقت پیدا کرنے والے لوگ ذمہ

داری کے مناصب پر قابض رہیں گے، مخلصین آگے بڑھ کر کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ آج ہمارا بس نہیں چلتا کہ ہم ان کو جماعت سے نکالنے میں کامیاب ہو جائیں۔ مگر جب ہمارا بس چلے گا انکو ملک سے خارج کرنے، جیل میں قید کرنے یا موت کی سزا دینے سے بھی گریز نہیں کریں گے۔ (انشاء اللہ تعالیٰ)

(۸) قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِیْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِیْكُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰی عٰلِمِ الْغَیْبِ وَ الشَّهَادَةِ فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ

(ان سے کہہ دو، اے نفس پرستو! جس موت سے تم اس قدر بھاگتے ہو وہ کچھ تمہیں چھوڑ نہ دیگی ایک دن ضرور آئے گی۔ پھر تم اُس خدا کی طرف لوٹائے جاؤ گے جو پوشیدہ اور ظاہر سب کچھ جانتا ہے پھر جو کچھ کرتے رہے ہو! وہ تم کو اس سے آگاہ کر دے گا۔)

موت سے مفر نہیں:

موت سے ڈرنے والے لوگ موت سے بچ نہیں سکتے۔ وہ نہایت نامعقول فکر میں پھنس کر رہ گئے ہیں۔ جس قسم کی توقعات انہوں نے باندھ رکھی ہیں، وہ مرنے سے پہلے کبھی پوری نہ ہو سکیں گی، بلکہ وہ حسرتیں لے کر مر جائیں گے اور پھر اتنے بڑے پروگرام کو برباد کرنے کی ذمہ داری کی جواب دہی کے لئے خدا کے سامنے حاضر ہوں گے، وہ ان کے تمام ظاہری کاموں اور ان کے دلوں کے خفیہ ارادوں کو بخوبی جانتا ہے۔

مسلمانوں کے لئے درس عبرت:

حاصل یہ ہے کہ قرآن عظیم نے تعلیم کے لئے دو نمونے پیش کئے، ایک قریش کا اور ایک آرین قوموں کا۔ یہ دونوں قرآن حکیم کو صحیح طور پر سمجھتے ہیں اور اس تعلیم کو آگے بڑھانے کے لئے جدوجہد جاری رکھیں گے۔ اور موت سے نہیں ڈریں گے، یہ حضرت مسیحؑ کے حواریین کا نمونہ تھا جو قرآن حکیم نے معین کیا ہے۔

اس کے بعد دوسری جماعت یہود کی پیش کر دی گئی ہے۔ جنہوں نے تورات پر عمل کرنا چھوڑ دیا ہے۔ چنانچہ کام کرنے والوں کو تنبیہ کر دی گئی کہ ان کے نمونے کی پیروی نہ کریں اور ان سے کوئی مشابہت اپنے اندر پیدا نہ ہونے دیں۔ جس طرح نصاریٰ نے باوجود یہود کے ہاتھوں تکالیف اٹھانے کے ان کی اس نالائق حرکت میں موافقت نہیں کی، مسلمان بھی اس بری حرکت میں ان کی موافقت نہیں کریں گے۔ قرآن حکیم نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت مسیحؑ کا نمونہ زندہ کر دیا، مگر وہ یہود کے طرز عمل سے بیزار ہے۔ یہود پر ایک دفعہ تو حضرت مسیحؑ کی مخالفت کرنے کی وجہ سے لعنت پڑی اور دوسری مرتبہ وہ قرآن حکیم کی مخالفت کی وجہ سے ملعون ہوئے، ان کی کبھی موافقت نہ کی جائے گی۔ انہوں نے طلب دنیا کو اپنی زندگی کا مقصد وحید بنالیا ہے۔ چنانچہ آج سرمایہ داری کا مرکز یہ ہو رہے ہیں۔

ہنود اور یہود کی مماثلت :

ہماری سمجھ میں ہندو برہمن، یہودیوں کا پورا پورا نمونہ ہیں۔ اگر یورپ میں سرمایہ داری کی مصیبت یہودیوں نے پیدا کر رکھی ہے، تو ہمارا خیال ہے کہ ہندوستان میں ہندو جو برہمنوں کے تابع ہیں سرمایہ داری کی وہی مصیبتیں پیدا کریں گے، جو یہود نے یورپ میں پیدا کیں۔ ہم ان لوگوں کے ساتھ مل کر کسی شکل میں کام کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر یہ ملکی خدمت میں کوئی سچا کام کریں تو اس میں بھی ان کے ساتھ شرکت نہ کریں۔ یعنی ان سے قطعی طور پر مستغنی ہو جائیں۔ ہم نے ابھی یہ درجہ اپنے لئے پیدا نہیں کیا۔ بعض اوقات وہ اچھا کام کرتے ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ ان سے علیحدہ رہ کر اتنا اچھا کام نہیں کر سکتے، تو ہم اس خاص حرکت میں ان کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم ان کا سارا پروگرام ماننے کے لئے تیار رہیں۔

(۹) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

(اے ایمان والو! جب جمعہ کے روز نماز کے لیے ندا کی جائے تو فوراً اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو اور خرید و فروخت چھوڑ دو، یہ تمہارے لیے بہتر ہے بشرطیکہ تم جانو!)

یہودیت سے بچنے کا طریق :

اب مسلمانوں کو ایسا طریقہ بتانا چاہئے کہ ان میں یہودیت نہ آئے۔ اس میں شک نہیں کہ کسی زمانے میں یہود اچھی قوم تھے۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ (۲:۴۷)

مگر ان میں بعد میں تنزل آ گیا مسلمانوں کو ان باتوں سے متنبہ کر دینا چاہئے جس سے یہ تنزل پیدا ہوا تاکہ وہ ان باتوں سے بچے رہیں۔

آیت نمبر ۹ میں اس امر کی توضیح شروع ہوتی ہے۔

جماعتی کام میں ایک دِقّت ہے۔ وہ یہ ہے کہ یا تو قرآن کی انقلابی تعلیم کے سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی تیاری ہو سکتی ہے یا روپیہ کمایا جا سکتا ہے۔ اگر اس قسم کا تعارض ایک وقت میں پیدا ہو جائے تو ہمیشہ روپیہ پیدا کرنے کے خیال کو چھوڑ دینا چاہئے۔ یہ جذبہ اسی وقت تک پیدا نہیں ہو سکتا جب تک قرآن کی تعلیم حاصل کرنے میں سعی نہ کی جائے۔

ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ

اگر تمہیں انقلابی تحریکوں کی حقیقت اور ان کی کامیابی کے پروگرام کا موازنہ ہے تو تم کبھی مالی منفعت کو اس انقلابی فکر یا ہمت پر ترجیح نہیں دو گے۔

انقلاب میں کامیابی کی شرط :

کسی جماعت میں انقلابی تحریک کی کامیابی کا انحصار اس امر پر ہوتا ہے کہ اس کے کارکنوں کا دماغ بلند ہو، وہ انقلابی معاملات کو آخر تک سوچ سکیں، ان کی ہمت اتنی بلند ہو کہ وہ اس راہ میں تمام مشکلات خندہ پیشانی سے برداشت کر سکیں۔ جب رہنمائے انقلاب حضرت محمد رسول اللہ ﷺ جمعہ کے روز خطبہ دیں، یعنی اگلے ہفتے کا پروگرام دیں تو وہ لوگ جو انقلاب کی حقیقت سمجھ چکے ہیں، اس اجتماع سے غیر حاضر نہیں ہو سکتے، وہ کسی مالی منفعت کے خیال سے اس جماعت کی حالت سے کوتاہی نہیں کر سکتے۔

(۱۰) فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَ ابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَ اذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۱۰

(پس جب نماز ادا ہو چکی ہو تو زمین پر چلو۔ اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔ اور اللہ کو بہت یاد کرو تا کہ تم فلاح پاؤ۔)

انقلاب اور جلبِ مال :

اس میں شک نہیں کہ انقلابی ضروریات اور مالی ضروریات شخصی کا تعارض پیش آئے تو انقلابی ضروریات کو ترجیح دی جانی چاہئے، مگر مقصود یہ نہیں ہے کہ اکتساب مال کو کلیۃً ترک کر دیا جائے، بلکہ انقلابی تعلیم حاصل کر لینے کے بعد اور پروگرام سیکھ چکنے کے بعد مالی منافع حاصل کرنے میں بھی پوری ہمت سے کام لو۔ مدعا صرف یہ ہے کہ حصول مال کو انقلابی کاموں پر ترجیح نہ دی جائے۔

"وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰه" یعنی جتنی مالی منفعت کی ضرورت ہے اس سے زیادہ اللہ سے طلب کرو، اس طرح تھوڑے وقت میں زیادہ کام کرنے کی ہمت پیدا کر لو تا کہ علمی مجلس میں جو وقت صرف کیا ہے اس کی کسر بھی نکل جائے۔

"وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ" ۔ جب تم مالی معاملات میں مصروف ہوتے ہو اس وقت بھی اللہ کو نہ بھولو۔ بلکہ اسے یاد رکھو، اللہ تمہیں اتنی سمجھ دے دے گا کہ تم اس کمی کو پورا کر لو۔

ایک محسوس مثال :

اگلی آیت میں اس کلیہ قاعدے کو ایک محسوس مثال کے ذریعے سے عام فہم بنادیا گیا ہے۔

(۱۱)وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَ ۨ انْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَآئِمًا ۭ قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝

(اور جب وہ لوگ تجارت یا تماشہ دیکھتے ہیں، تو اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور آپ کو کھڑا ہوا چھوڑ جاتے ہیں! کہہ دو جو اللہ کے پاس ہے وہ تماشہ اور تجارت سے کہیں بہتر ہے اور اللہ بہتر روزی دینے والا ہے۔)

ایک دفعہ رسول اکرم ﷺ نماز جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے کہ ایک قافلہ آیا۔ لوگ خطبہ چھوڑ کر قافلے والوں سے ملنے چلے گئے، تاکہ پہلے معاملہ کر کے زیادہ نفع حاصل کر سکیں۔ اس قسم کی غلطی نہیں کرنی چاہئے۔ جب انقلابی، علمی کام ہو رہا ہو تو ملی معاملات اور کھیل کود سب مؤخر کر دینے لازم ہیں۔

قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ

یاد رکھو قرآن حکیم کی انقلابی تعلیم سے جو طاقت جماعت میں پیدا ہو گی وہ تجارت اور لہو و لعب سے بدرجہا بہتر ہے۔

وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝

انسان انقلابی عقل میں جتنی ترقی کرے گا، اتنا ہی تجارت میں بھی زیادہ نفع کمانے کی قابلیت پیدا کرے گا۔

تجارتی پیچ بھی انقلابی تحریکات کے داؤ پیچ کی مانند ہیں۔ جن لوگوں کے دماغ انقلابی مسائل حل کر سکتے ہیں، وہ اس دماغی قوت کو تجارتی کاموں کی طرف متوجہ کریں، تو وہاں بھی مفید نتائج حاصل کر سکتے ہیں۔